ڈاکٹر تبسم کاشمیری

وی۔۸۵فیزII،ڈی ایچ اے،لاہور کینٹ

تنقیدِ راشد

Dr. Tabasam Kashmiri

V-85 phaase II,DHA,Lahore cantt

Criticism on Rashid

N M Rashid is the prominent poet of our era.His poetry was widely appriciated by the contemporary critics Auring the Rashid centenary some critics have put light on his ideology related with pakistan .In this article this aspect is discussed.

راشد پر تنقید کا آغاز ''ماورا'' کی اشاعت سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا اس سلسلہ میں ۱۹۳۹ء میں فیض صاحب نے راشد پر ایک تعارفی قسم کا مضمون قلم بند کیا تھا جو شاید ''راوی'' میں شائع ہوا تھا۔ راشد، تاثیر، فیض اور میرا جی پر تنقید کا ایک محاذ یو۔ پی کے ان بزرگ ادیبوں پر مشتمل تھا جن میں نیاز فتح پوری، مسعود حسن رضوی ادیب، عندلیب شادانی اور اختر علی تلہری قابل ذکر ہیں۔ اس محاذ نے جو کچھ لکھا تھا وہ فرقت کاکوروی نے ''مداوا'' میں جمع کر دیا تھا ''مداوا'' کے مواد کی قدر و قیمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اب یہ کتاب ہماری ادبی تاریخ کے حافظہ میں ذرا مشکل ہی سے تلاش کی جا سکتی ہے۔ راشد کے بارے میں ان حضرات نے جو کچھ لکھا تھا وہ ادب کی طاق نسیاں کے سپرد ہو چکا ہے جب کہ راشد کی شاعری اردو ادب کی تاریخ میں پوری درخشانی کے ساتھ نظر آ رہی ہے۔

راشد کو دیکھنے کا ایک انداز وہ تھا جسے ''ماروا'' کی اشاعت کے بعد حیات اللہ انصاری نے اختیار کیا تھا۔ فرائیڈ اور ایڈلر کی نفسیات سے متاثر ہونے والے حیات اللہ انصاری نے ذہنی ناپختگی سے راشد کی شاعری کا جائزہ لیا تھا اور اپنی کتاب شائع کی تھی جس کا نام ''ماوراپر'' تھا۔ فرائیڈ سے متاثر ہونے والے اس نقاد کو ماورا کا نصف آخر شہوت کے جذبات سے بھرا ہوا نظر آیا تھا یا انھیں جنسی ایذا رسانی کے منظر نظر آئے تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ محدود وژن رکھنے والے نقاد سے یہی توقع کی جا سکتی تھی۔ راشد کے پیچیدہ شعری عمل، کلونیل سوسائٹی میں شاعر کے کردار، اس کے سیاسی و سماجی ردعمل اور کلونیل ازم کے تصادمات سے بننے والی نفسیات تک حیات اللہ انصاری کو رسائی حاصل نہ تھی۔ انصاری، راشد کی اس ایذا رسانی کا تجزیہ نہ کر سکے کہ جو ایذا رسانی ان کو کلونیل سماج سے پہنچ رہی تھی مگر راشد کی جنس کے منظر ان کی نظر میں معلق ہو گئے تھے۔ انصاری کی کتاب سے ناراض ہو کر راشد یہ بات کہنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ یہ کتاب کم علمی، بے ذوقی اور بد دیانتی کی بہترین مثال ہے۔ راشد کی خوش قسمتی تھی کہ اسی زمانے میں ریاض احمد اور ممتاز مفتی نے انصاری کے ردّ اور راشد کے دفاع اور تحسین شعری پر طویل مضمون قلم بند کیے تھے۔ اس پرانی داستان کو دہرانے اور اس کی یاد کو تازہ کرنے کا مقصد یہ تھا کہ میں یہ واضح کر سکوں کہ آغاز ہی سے تنقید راشد کی بنیاد غلط طور پر رکھی گئی تھی اور اس کے اثرات دیر تک محسوس کیے گئے تھے۔ بعد ازاں ترقی پسند نقادوں نے بھی راشد کی آزادہ روی اور جنس کو تختۂ مشق بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ ان کی تنقیدی جارحیت کے مظاہرے تا دیر جاری رہے تھے۔ عزیز احمد جیسے روشن خیال ادیب کو راشد کے ہاں مریضانہ جنس پرستی نظر آتی تھی۔ راشد کے جنسی تشدد، بے راہ روی اور مریضانہ جنس پرستی کا طوفان اس لیے اٹھا تھا کہ راشد نے تخلیقی اظہار صیغہ واحد متکلم میں کیا تھا۔ یہ ہرگز ضروری نہیں تھا کہ واحد متکلم میں خود راشد موجود ہو۔ یہاں نظم میں راشد کا تخلیق کردہ خاص کردار ہو سکتا تھا جو کلونیل سوسائٹی میں ظلم و جبر برداشت کرتے ہوئے اپنے جذبات کا اظہار کر رہا ہو۔ مگر اس کردار کو راشد سمجھ کر نظموں کی غلط تعبیر کی گئی تھی۔ جس کی وضاحت کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں۔

یہ سمجھا جاتا ہے کہ راشد کے ہاں جدید اردو شاعری کا شعور پہلی بار بلند ہوا تھا۔ یہ تجربہ اتنا نیا، اتنا انوکھا اور اتنا حیران کن تھا کہ ۱۹۴۷ء سے پہلے کا دور اپنی روایت پسندی کے باعث ادبی صدمے سے دوچار ہو کر اور شعری تفہیم سے عاری ہوتے ہوئے راشد پر ناروا تنقیدی حملے کرتا رہا تھا۔ ۱۹۴۷ء سے پہلے شعرِ راشد کا تفہیم میں جس شخص نے زبردست کردار ادا کیا وہ میراجی تھا۔ میراجی کی تنقید نے تفہیم راشد کی منزلوں کو آسان کیا اور جدید شاعری کی تفہیم کے لیے جو عملی نمونے پیش کیے ان سے راشد کی شاعری کو سمجھنے کے لئے تفہیمی مشقیں تیار کی جا سکتی ہیں، یوں دیکھا جائے تو میراجی کا اثر ہمارے اس دور تک آ پہنچا ہے۔ میرے خیال میں میراجی کی روایت پر عمل کرتے ہوئے ہمارے عہد کے نئے نقادوں نے بھی راشد کی نظموں کی تفہیم میں حصہ لیا ہے۔ میرے خیال میں اب تک راشد کی تیس کے قریب نظموں کی تفہیم و تحسین پر کام کیا گیا ہے اور اس روایت سے راشد شناسی کے کام میں بہت مدد ملی ہے۔ میں ذاتی طور پر تنقید راشد کے اس زاویے کو بہت اہمیت دیتا ہوں۔ اب چونکہ راشد دانش گاہوں کے نصاب کا حصہ بن چکا ہے اس لیے مذکورہ تجزیاتی تنقید طلبہ کی رہنمائی کے لیے بہت مفید قرار دی گئی ہے۔

تنقیدِ راشد کا ایک اہم مقام وہ ہے جب ۱۹۵۵ء میں ''ایران میں اجنبی'' پطرس بخاری کے دیباچہ کے ساتھ شائع ہوئی۔ ایران میں قیام کے باعث اس مجموعے پر فارسی کے گہرے اثرات غالب آ گئے تھے۔ شعری اسالیب مفرس ہو گئے تھے۔ ''ماورا'' میں اردو کا جو رنگ موجود تھا وہ کم زور پڑ گیا تھا۔ پطرس نے اپنے دیباچہ میں راشد کی نظموں سے متعلق سماجیات اور سیاسیات کے صرف حوالے دیے تھے دراصل ان کی توجہ کا مرکز راشد کی شعری لغت یا شعری اسلوب تھا اس لیے انہوں نے راشد کو خطاب کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ "آپ نے بڑے بڑے کوہ قافی الفاظ کو بھی ایسا مطیع کر لیا ہے کہ خانہ زاد معلوم ہوتے ہیں" مرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ پطرس نے راشد کی شاعری کے پس منظر یا پیش منظر میں کام کرنے والی سیاسی قوتوں، نوآبادیاتی اثرات اور شعری سماجیات پر اسالیب کو ترجیح دی تھی۔

تنقیدِ راشد میں ہم جوں جوں آگے بڑھتے ہیں ہم مختلف نقادوں کو ان کی شعریات کی مختلف جہتوں کا تجزیہ کرنے میں مصروف دیکھتے ہیں۔ یہ نقاد زیادہ تر ان کی خالص شعری جہتوں کو پرکھنے میں لگے رہتے ہیں۔ ادبی نقادوں کا یہ عمومی تنقیدی رویہ ہے کہ ان کی دل چسپیوں کے تمام تر مراکز خالص ادبی جہتوں تک ہی محدود رہتے ہیں اس سے آگے زندگی کی دوسری منازل کی طرف دیکھنے کی وہ بہت کم زحمت برداشت کرتے ہیں۔ مثلاً وزیر آغا نے ان کو ''تمنا کی سیال کیفیت'' کا شاعر کہا ہے اور پھر اپنے مخصوص اندازِ تنقید کے حوالے سے وہ تمنا کی عمودی اور افقی کیفیت کا جائزہ لیتے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے راشد کے شعری آہنگ کو اہمیت دے کر ان کی شاعری کو شعرا لصوت کا درجہ دیا ہے۔ فاروقی کے نزدیک یہ راشد کا کارنامۂ خاص تھا۔

پروفیسر جیلانی کامران نے راشد پر کئی مضمون لکھے تھے۔ راشد پر ان کی تنقید ہم عصر نقادوں سے بالکل مختلف ہے۔ انہوں نے راشد کو ایک اور ہی زاویے سے دیکھنے کی سعی کی ہے۔ راشد کی شاعری کے متحرک کردار کو سبھی نقاد تسلیم کرتے ہیں۔ ''ماورا'' سے ''گمان کا ممکن'' تک تواتر کے ساتھ اس میں خیال و فکر کی ایک متحرک قوت کارگر ملتی ہے۔ جو ان کی شاعری کو ارتقائی سفر کی طرف لے جاتی ہے۔ اس سفر میں ان کا شعری وژن پہلے سے زیادہ متحرک، زرخیز اور شاداب نظر آتا ہے مگر جیلانی کامران راشد کی شاعری کے متحرک کردار کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ راشد کی وہ فکری جہت جو ''ماورا'' کے دور میں متعین ہوئی تھی یہی جہت ان کے آنے والے مجموعوں میں نمودار ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ یہ کہتے ہیں کہ راشد ''ماورا'' کا شاعر تھا اور ماورا ہی کا شاعر رہا۔ یعنی اپنے تخلیقی عمل میں ماورا سے آگے نہ بڑھ سکا۔ جیلانی کامران کی اس رائے سے ہمیں بالکل اتفاق نہیں ہے ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ جو فرق ''بانگ درا'' اور ''بال جبریل'' میں ہے وہ ''ماورا''، ''ایران میں اجنبی'' یا ''لا=انسان'' میں نہیں ہے۔ یہی بات ''ماورا'' اور ''گمان کا ممکن'' کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

اب میں اردو کے ایک دانش ور نقاد صفدر میر کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ صفدر میر نے راشد کی شاعری کے ایک اہم پہلو کی طرف توجہ دلائی تھی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ راشد کو خود اس کی اپنی نظموں کا اہم ترین کردار سمجھ لیا گیا تھا اور یہ راشد کے ساتھ بہت بڑی ناانصافی تھی۔ عام نقاد یہ سمجھتے تھے کہ راشد کی شاعری اس کے اپنے ذاتی تجربات کے سوا کچھ نہیں۔ اسی وجہ سے ''انتقام'' اور ''اجنبی عورت'' کا مفہوم غلط طور پر وضع کر لیا گیا۔ صفدر میر نے اس نکتے کی طرف توجہ دلائی تھی کہ راشد کا واحد متکلم وہ خود نہیں بلکہ اس کے ڈرامائی کردار ہیں۔ سعادت سعید نے راشد کے کرداروں کے حوالے سے یہ بات کہی تھی کہ راشد نے قدیم شاعروں کے خیالی و تخیلی کرداروں کی بجائے زندہ، متحرک اور جان دار کرداروں کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔

تنقیدِ راشد کے اس بہت مختصر سے جائزے سے جو تنقیدی جہات سامنے آئی ہیں ان سے بخوبی طور پر یہ واضح ہوتا ہے کہ تنقید راشد میں جس جہت پر سب سے زیادہ توجہ دی گئی ہے وہ ان کی شاعری کا ادبی کردار ہے۔ بلاشبہ اسی کردار پر ان کی شاعری کی اساس بنائی گئی ہے اور یہی اساس ان کی شعری عظمت کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ شاعر کو اول و آخر شاعر ہونا چاہیے۔ اس کے منفرد شعری محاسن اسے انفرادیت عطا کرتے ہیں۔ فلسفہ اور فکر اس کی شاعری کو زیادہ وقیع بنانے کا کردار ادا کرتے ہیں۔ اب جو تنقید سامنے آئی ہے اس میں نقادوں نے راشد کے شعری محاسن پر زیادہ توجہ صرف کی ہے اور اس کے افکار اور نظریے کو پس منظر میں رکھا ہے۔ ۲۰۱۰ء میں ملک بھر میں راشد صدی کے موقع پر بہت اچھی تقریبات اور سیمنیار منعقد ہوئے۔ توجہ کا مرکز راشد کی شعری محاسن ہی رہے ان کے افکار اور نظریات اس موقع پر بھی پس منظر ہی میں دکھائی دیے۔

راشد کو وسیع گلوبل صورت حال میں بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔ راشد کی نظمیں ہنگامی، وقتی، یا کسی اتفاقی صورت حال کو بیان نہیں کرتی ہیں جیسے ہمارے ہاں مولانا ظفر علی خان کی مثال دی جاسکتی ہے۔ چوں کہ راشد کی نظموں کا کینوس بنیادی طور پر علامتی ہے۔ اس لیے مطالب کے اظہار میں یہ کسی وقتی صورت حال پر بھی منطبق ہوسکتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ متن کی شرح میں قاری یا نقاد متن کی تشریحات میں اپنا منطقی حق رکھتا ہے اور یہ حق اسے اختیار دیتا ہے کہ وہ نظم کی معنویت کو بیان کرے۔ پروفیسر فتح محمد ملک نے اپنے اس حق کو استعمال کرتے ہوئے راشد کی نظموں کی شرح ان کے عہد کی سیاسی صورت حال کے حوالے سے بیان کر کے نظموں کو ایک ٹائم فریم میں معنویت بخشی ہے۔ اس میں متن کی تشریح کا کمال ہے اور راشد کے علامتی کینوس کا بھی۔

تنقیدِ راشد میں یہ پہلی کوشش ہے جو راشد کی شاعری کے فکری و نظریاتی افق ہمارے سامنے لاتی ہے۔ یہ نیا افق اس سماجیات، سیاسیات اور کلونیل سوسائٹی کو پیش کرتا ہے جو راشد کے عہد میں موجود تھی اور یہ صورت حال راشد کے عہد سے آگے بڑھ کر خود ہمارے اپنے عہد تک پھیلی ہوئی ہے۔ استحصال اور کلونیل ازم کی بدلی ہوئی شکلوں کے جال بدستور پھیلے ہوئے ہیں۔ استعماری قوتیں اسی طرح غالب ہیں کہ انسان اسی طرح سے پس رہا ہے اور اذیت میں ہے کہ جس طرح راشد اپنے دور میں تھا۔ یہ اذیتی منظر نامہ اسلامی ممالک کا ہو یا استحصال سے گھائل دوسرے ملکوں کا، ان میں تبدیلی نہیں ہوسکی ہے۔ البتہ ابتری کی حالتیں زیادہ دردناک ہوگئی ہیں۔ راشد نے اپنی شاعری میں بار بار جس نئے انسان کی بشارت دی تھی وہ انسان راشد کی نظموں میں تو موجود ہے مگر یہ انسان مجھے دور دور تک نظر نہیں آتا ہے۔ یہ ترقی پسندوں کا اثر تھا یا ان کی ذات کی رجائیت کے اثرات تھے کہ انہوں نے نئے انسان کے ظہور پر جشن کی سی کیفیت کا اظہار کیا تھا۔ شاید یہ ان کی رجائیت ہی تھی یا نئے انسان اور اس کے مستقبل کے لیے ازبس تمناؤں کا اظہار تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ تسلسل کے ساتھ انسان کے استحصال، ظلم، بربریت اور محرومیوں کے داستان گو بھی تھے۔ ان ہی مسائل کو پروفیسر فتح محمد ملک صاحب نے پاکستانیت سے تعبیر کیا ہے اور راشد کی یہ پاکستانیت ایک حد تک زمینی اور جغرافیائی حدود کے تجربے کا نتیجہ ہے اور راشد کی یہ پاکستانیت زمین اور جغرافیائی حدود کے تجربے کا نتیجہ ہے، مگر یہ پاکستانیت علامتی سطح اختیار کر کے ایک آفاقی تجربے کی مظہر ہو جاتی ہے۔ جسے گلوبل صورت حال میں بھی سمجھنے کی ضرورت ہے۔ میرے خیال میں بڑی شاعری کو مختلف سطحوں پر دیکھا جاسکتا ہے اور یہی کیفیت ہمیں راشد کے ہاں ملتی ہے۔

حمید نسیم نے کہا تھا کہ لسانی اور جغرافیائی حدود سے نکل کر راشد عالمی سطح کے شاعر بن جاتے ہیں۔ فخر الحق نوری کا خیال ہے کہ وہ عظیم شاعر ہیں اور زمان و مکان کی حدود کو پھلانگ کر عالمی شاعر کا درجہ رکھتے ہیں۔

کتاب کے آغاز میں پروفیسر فتح محمد ملک نے راشد کی شاعری کی جو تھیوری بنائی ہے اس کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اردو تنقید نے راشد کے ہاں ہیئت، تکنیک اور آہنگ کی تحسین کا حق خوب ادا کیا ہے مگر یہ داد و تحسین ان کی شاعری کے فکری و نظریاتی محاسن کا پردہ ہو کر رہ گئی ہے۔ چنانچہ اس کتاب کا جو کلیدی حاصل ملک صاحب نے بیان کیا ہے وہ شعر راشد کے فکری نظریاتی محاسن ہیں کہ جن کی طرف راشد کے نقادوں نے خاطر خواہ طور پر توجہ نہیں دی ہے۔ ملک صاحب چوں کہ بنیادی طور پر نظریاتی ادیب ہیں اس لیے ان کی توجہ راشد کی فکری و نظریاتی پہلوؤں پر مرکوز ہوئی ہے۔ راشد کی شاعری کو Theorise کرتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ راشد کا سیاسی شعور ان کے گہرے روحانی احساس کا فیضان ہے۔ اس نقطۂ نظر کو آگے بڑھاتے ہوئے اور اپنی تھیوری کو مزید تقویت دیتے ہوئے وہ یہ کہتے ہیں کہ راشد کی شاعری کا مقصد ان کی شخصیت کے باطنی پیچ و تاب اور روحانی ساز و سامان سے نمودار ہوا ہے۔ اس لیے ہم راشد کی شاعری میں سیاسی شعور اور روحانی احساس کو بغل گیر پاتے ہیں۔ فتح

محمد ملک نے راشد کی شاعری کی جو تعبیر کی ہے وہ ہماری مروجہ تنقیدِ راشد سے بالکل مختلف ہے۔ مروجہ تنقید راشد، راشد کی شاعری کے منابع میں مسلمانوں کی تہذیب کے اثرات کو بیان کرتی ہے۔ ایک ہزار برس سے زیادہ عرصے پر پھیلے ہوئے ان کے تہذیبی لاشعور کا تجزیہ کرتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ دورِ راشد کے سماجی و سیاسی حقائق کا ذکر کرتی ہے جو ان کی تخلیقی دنیا پر اثر انداز ہوئے۔

مگر تنقیدِ راشد میں اس بات کا کوئی مذکور نہیں کہ ان کا سیاسی شعور ان کے گہرے روحانی احساس کا فیضان ہے۔ تنقید راشد کی اسی نئی جہت کو پروفیسر فتح محمد ملک صاحب کی فکری تعبیر کہا جا سکتا ہے اور ان کے اس زاویہ نظر سے تنقیدِ راشد کا ایک بالکل نیا زاویہ ہمارے سامنے آیا ہے۔ انہوں نے پاکستان اور عالم اسلام کے مسائل کے حوالے سے راشد کی شاعری میں جو معنوی شناخت دریافت کی ہے وہ بہت توجہ طلب ہے۔ اس کتاب نے راشد کو مروجہ تنقید سے بلند ہو کر فکری، نظریاتی اور روحانی جہات میں تلاش کیا ہے اور یوں راشد ایک مختلف شکل میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔

راشد صدی پر شائع ہونے والی کتابوں کے بارے میں بھی بہت کچھ کہا جا سکتا ہے مگر اس کے لیے ایک علیحدہ مضمون کی ضرورت ہے۔